مولانا قاضی بشیر احمد

عدالتی مشاہدات اور تاثرات

راقم حکومت آزاد کشمیر کے شعبہ قضا میں قاضی کے منصب پر فرائض انجام دیتا رہا ہے اور تیس سال کی مدت ملازمت مکمل ہونے پر مورخہ ۲۰۰۲/۸/۱۶ء کو ضلع قاضی کی حیثیت سے ریٹائر ہوا ہے۔ راقم کے فرائض کا دائرہ کار فوجداری قوانین پر عمل درآمد تک محدود رہا۔ بندہ نے دوران ملازمت بے شمار نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ ان مشاہدات و تاثرات کو اگر پورے طور پر قلم بند کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی لیکن وقت کی قلت کے باعث سردست مندرجہ ذیل سطور پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

عدل وانصاف کو قائم رکھنا جتنا اہم ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ عدل درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر انصاف کا پلڑا کسی ایک جانب جھک جائے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ نظام تبھی درست ہو سکتا ہے کہ عدل وانصاف کا پلڑا برابر رہے۔ عدل وانصاف کو قائم رکھنے کی ذمہ داری ہر شخص پر اپنے اپنے اختیار اور حدود کے مطابق عائد ہوتی ہے تاہم ان افراد پر یہ ذمہ داری زیادہ عاید ہوتی ہے جو جج یا قاضی کی حیثیت سے کام کرنے پر مامور ہیں۔ ان کے اختیارات درحقیقت لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں اور یہ افراد ان حقوق کے امین ہوتے ہیں لہٰذا حق کو حقدار تک پہنچانا جج یا قاضی کا بنیادی فریضہ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الأمانات الی أھلھا (النساء ۵۸) ''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے حق داروں کے سپرد کر دو'' اس ارشاد سے یہ معلوم ہوا کہ اگر حق کو حقدار تک نہ پہنچایا گیا تو یہ خیانت ہوگی۔

موجودہ نظام عدالت کچھ ایسا ہے کہ انصاف ملنے تک ایک صبر آزما اور طویل زمانہ لگ جاتا ہے اور اتنا مہنگا ہے کہ لوگ اپنی جائیداد کو فروخت کر کے مقدمہ لڑنے پر مجبور ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ عدالتوں سے مایوس ہو کر ان کی طرف رخ کرنے کے بجائے ظلم سہہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں یا پھر بوجھل دل سے راضی نامہ پر گزارا کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی یوں تو بہت سی وجوہ ہیں لیکن چند اہم نوعیت کی وجوہ ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں۔

۱۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے دن سے ہی ملک کے وسائل وذرائع استعمال کر کے ایسے افراد تیار کیے جاتے جو حکومتی، انتظامی اور عدالتی امور میں درج ذیل اصولوں کی پاس داری کی

روایت قائم کرتے:

(الف) پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے۔ (ب) ریاست کا قانون قرآن وسنت ہے۔ (ج) جو پچھلے قوانین شریعت سے متصادم ہیں، وہ کالعدم قرار دیے جائیں۔ (د) ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

مگر نصف صدی گزرنے کے باوجود عملاً ایسے افراد تیار نہیں کیے گئے۔ ہمارے ملک کی قانون کی درسگاہوں اور کالجوں سے جو طلبہ فارغ ہو کر نکلتے ہیں، وہ اسلامی قوانین سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین کے اجرا کے لیے تو موزوں ترین مگر اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لیے غیر موزوں ہوتی ہیں۔ الا ماشاءاللہ

اس خامی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کالجوں میں داخلے کے لیے عربی زبان سے واقفیت کو لازم قرار دیا جائے۔ اگرچہ اسلامی قوانین سے متعلق کافی ذخیرہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے مگر یہ ثانوی نوعیت کا علم ہے۔ عربی زبان کی ضرورت اپنی جگہ پھر بھی باقی ہے۔ قانون کے طالب علم کو اصول قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ، اسلامی فقہ کی تاریخ، بڑے فقہی مذاہب کا مطالعہ اور قرآن وحدیث کا علم متعلقہ ماہرین علم وفن کی نگرانی میں ضروری ہے تاکہ علمی اعتبار سے موزوں ترین افراد تیار ہو سکیں۔ اس وقت جن افراد کے ہاتھوں میں انصاف کا قلمدان ہے، وہ انہی لا کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں جن میں اکثر وبیشتر کو قرآن حکیم دیکھ کر بھی صحیح پڑھنا نہیں آتا اور نہ ان کو آخرت کے محاسبے کی فکر ہے۔ سائل عدالت کے باہر انصاف ملنے کے انتظار میں ہوتا ہے اور منصف اس کی حالت زار سے بے خبر چائے کی میز پر محو گفتگو ہوتا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے لا کالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو سیرت وکردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں اور جن کی راست بازی اور عدل وانصاف پر مکمل اعتماد کیا جا سکے مگر اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جج کے منصب پر فائز کرنے کے لیے اس کی پرہیزگاری اور خدا ترسی کو نہیں دیکھا جاتا جبکہ شرعاً انصاف فراہم کرنے والے کی سیرت وکردار کو بنیادی معیار کی حیثیت حاصل ہے۔ خلاصہ یہ کہ انصاف کی کرسی پر ایسے افراد کو بٹھایا جانا چاہیے جن کے اندر علمی کمال کے علاوہ عملی کمال بھی نمایاں طور پر موجود ہو۔ جبکہ اس وقت یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر اس منصب پر جو لوگ آتے ہیں، ان کی حالت دینی لحاظ سے قابل رحم ہوتی ہے۔

۲۔ منصب عدالت کے لیے خصوصاً چھان پھٹک کر آدمی کا انتخاب کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اگرچہ اس وقت ''پبلک سروس کمیشن'' قائم ہے مگر وہ کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ دو کمالات کا ہونا ضروری ہے یعنی ایک علمی کمال اور دوسرا عملی کمال، لیکن پبلک سروس کمیشن کے جو ممبر ہیں وہ خود اپنی جگہ محل نظر ہیں۔ اس

لیے خصوصاً اس منصب کے انتخاب کے لیے ایک الگ جوڈیشل کمیشن ہونا چاہیے جس کے ممبر وہی لوگ ہوں جو خود اچھی شہرت کے حامل منصف ہوں یا منصف رہ چکے ہوں۔ وہ اس منصب کے امیدوار سے وہی سوالات پوچھیں جو عدل وانصاف سے متعلق ہوں جبکہ موجودہ پبلک سروس کمیشن کے ممبران میں یہ صفات مکمل نہیں ہیں اور نہ ہی اس منصب کے متعلقہ سوالات پوچھنے کی حد تک محدود ہیں۔ اس مرحلہ پر میں یہ بھی کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ خصوصاً ''منصف'' کے منصب پر محض میرٹ اور سیرت کو بنیاد بنایا جائے جبکہ موجودہ دور میں ہر ضلع کا الگ کوٹہ مقرر ہے لیکن یہ طرز عمل انصاف کے حصول میں رکاوٹ ہے اس لیے کہ کوٹہ کی پابندی کی وجہ سے ممکن ہے کہ موزوں ترین آدمی اس منصب پر آنے سے رہ جائے اور اس سے کم درجے کا آدمی اس منصب پر فائز ہو جائے۔ البتہ اگر دونوں آدمی برابر ہوں تو کوٹہ کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس چھان پھٹک کے بعد اگر لوگ عدالت کی کرسی پر بیٹھیں گے تو اس سے حصول انصاف کا سفر بہت سے امور میں مختصر ہو جائے گا اور حقدار کو حق ملنے کی قوی امید پیدا ہوگی۔

۳۔ کسی مقدمہ کے یکسو ہونے تک نظام تعمیلات کو بہت اہمیت حاصل ہے جبکہ موجودہ تعمیلات کا نظام بہت ہی ناقص ہے جس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ بر وقت تعمیلات نہ ہونے کی وجہ سے مقدمات کے فیصلہ جات میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے خصوصاً اس وقت فوجداری میں تعمیلات کا نظام صحیح نہیں ہے۔ یہ کام پولیس کے سپرد ہے جو ہر ضلع میں ایس پی کے ماتحت ہوتی ہے۔ مطلوبہ آدمی کو کوئی بار سمن بلکہ وارنٹ کے ذریعہ طلب کیا جاتا ہے اس کے باوجود بر وقت تعمیلات نہیں ہو پاتیں۔ ایس پی کا اس بارے میں عام طور پر یہ عذر ہوتا ہے کہ پولیس کی نفری کم ہے اور کام اس نسبت سے بہت زیادہ ہے۔ پولیس کے ذمہ دیگر بہت سے انتظامی نوعیت کے کام ہوتے ہیں اس لیے تعمیلات کے لیے بر وقت پولیس کے افراد مہیا نہیں ہوتے۔ اس صورت حال کے پیش نظر تعمیلات کی اصلاح کے لیے یوں تو متعدد تجاویز زیر بحث رہی ہیں جن میں سے میرے نزدیک ایک تجویز موزوں ترین ہے جس کا ذکر اس مرحلہ پر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ تعمیلات کا شعبہ ہی الگ ہو جو انتظامی نوعیت کے فرائض انجام دینے سے الگ تھلگ ہو۔ یہ شعبہ براہ راست ہائی کورٹ کے ماتحت ہو اور ماتحت عدالتوں میں تعمیل کرنے والے کانسٹیبل متعلقہ عدالت کے ماتحت ہوں جن کی ترقی، تنزلی، تبدیلی، معطلی اور تنخواہ جیسے امور کا اختیار متعلقہ عدالت کو حاصل ہو اور متعلقہ عدالت کی پیروکار سرکار اس کی نگران ہو۔ اب تعمیلات کے علاوہ ان افراد کا کوئی اور کام نہ ہوگا اس لیے تعمیلات کی وجہ سے مقدمہ کو یکسو نہ کرنے کی شکایت ختم ہو جائے گی۔

اس تجویز پر اتفاق بھی ہوا تھا مگر حکومت نے مالی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کام فردا پر ٹال دیا۔

۴۔ نظام وکالت کی اہمیت: نظری حیثیت سے نظام وکالت کی خوبی سے انکار نہیں ہے اس لیے کہ وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ عدالت کو قانون سمجھنے اور زیر سماعت مقدمہ کے حالات پر منطبق کرنے میں مدد دے۔ اصولاً یہ ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ایک مقدمہ میں دو ماہرین قانون کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک

کی رائے میں ایک فریق کا مقدمہ مضبوط ہو تو دوسرے کی رائے میں دوسرے فریق کا اور عدالت کے لیے صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں دونوں طرف کے دلائل سے مطلع ہونا یقیناً مفید ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورت موجودہ طریقہ وکالت میں اختیار کی گئی ہے، کیا فی الواقع اس سے دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ اس وقت عملاً صورتحال یہ ہے کہ وکیل اپنی قانونی مہارت کو لے کر قانون کی دوکان کھول کر گاہک کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے۔ مقدمہ کا جو فریق اس کو دماغ کا کرایہ زیادہ ادا کرے، اس کا دماغ اس کے حق میں قانونی نکات سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ میرا مؤکل حق پر ہے یا باطل پر۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے مجھے فیس دی ہے اور میرا کام اس کی حمایت کرنا ہے۔ اس لیے وہ مقدمہ کی نوک پلک سنوار کر اس کو قانون کے مطابق ڈھالتا ہے، کمزور پہلوؤں کو چھپاتا ہے اور موافق پہلوؤں کو ابھارتا ہے، روداد مقدمہ اور شہادتوں میں سے چن چن کر صرف وہ چیزیں نکالتا ہے جو اس کے مؤکل کی تائید میں ہوں۔ گواہوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مقدمہ کے صحیح واقعات جو اسکے مؤکل کے خلاف ہوں، سامنے نہ آسکیں یا کم سے کم ہو جائیں۔ اس طریقہ سے عملاً وکیل کا کردار یہ رہ گیا ہے کہ وہ جج کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب خواہ حقیقی مجرم چھوٹ جائے یا کوئی بے گناہ پھنس جائے، وکیل کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پیشۂ وکالت نے ہمارے نظام عدالت کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اس کا نقصان ہماری پوری اجتماعی زندگی میں پھیل گیا ہے اور ہماری سیاست بھی اس کی وجہ سے گندی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان حالات میں موجودہ نظام وکالت کی اصلاح کی سخت ترین ضرورت ہے۔ بالفرض اگر اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو اس کو بتدریج ختم کر دینا ہی حصول انصاف کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ قانون شہادت ۱۸۷۲ء پر ایک نظر: کسی مقدمہ کو یکسو کرنے کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں ایک اہم عنصر شہادت کا بھی ہے۔ اس وقت عدالتوں کے اندر قانون شہادت وہی ہے جو ۱۸۷۲ء کا مرتب کردہ ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے اس کی بہت سی دفعات میں خامیاں ہیں جن میں سے کچھ کی نشاندہی درج ذیل سطور میں کی جاتی ہے۔

دفعہ نمبر ۳ میں ''Evidence'' کی تعریف مانع نہیں۔ اس تعریف کی رو سے تمام دستاویزات کو بھی شہادت کہہ دیا جاتا ہے اور متعلقہ قرائن کو بھی۔ فقہی اعتبار سے یہ تعریف ''ثبوت'' کی تو ہو سکتی ہے لیکن ''شہادت'' کسی انسان کے بیان ہی کو کہا جا سکتا ہے، خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری۔

"Proved" کی تعریف میں:

"After considering the matter before it"

کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیے:

"and observing the requirments of sharia"

دفعہ نمبر ۲۴ میں ہے کہ اگر اعتراف جرم کی ترغیب دی گئی ہو تو ایسا اعتراف بھی غیر مؤثر قرار دیا گیا ہے حالانکہ محض ترغیب سے اعتراف کالعدم نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ حدیث لعان میں ''اِنَّ عَذَابَ الدُّنْیَا اَعْظَمُ مِنْ عَذَابِ الْاٰخِرَۃِ '' کہنا ایک طرح کی ترغیب بھی ہے لہذا اس دفعہ اور دفعہ نمبر ۲۸ سے "Inducement" اور "Promise" کا لفظ نکال دینا چاہیے۔

دفعہ نمبر ۲۹ کی رو سے دھوکے سے حاصل کیا ہوا یا نشے کی حالت میں کیا ہوا اقرار غیر مؤثر نہیں ہوتا۔ شرعاً نشے کی حالت میں کیا گیا اقرار غیر مؤثر ہے اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعزؓ کے بارے میں یہ اطمینان فرمایا کہ انھوں نے شراب تو نہیں پی رکھی؟ البتہ دھوکے سے کیے ہوئے اقرار کا معاملہ قابل غور ہے اور رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ ایسا اقرار بھی جرم کا کافی ثبوت نہ ہونا چاہیے۔

باب نہم دفعہ نمبر ۱۳۸ کی ترتیب شرعاً یوں ہونی چاہیے:

(۱) بیان گواہ (Examination in chief)

(۲) سوالات قاضی (Court question)

(۳) جرح فریق مخالف (Cross examination)

(۴) بیان مکرر منجانب مشہودلہ (Re-examination)

اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام میں تمام تر سوالات فریقین کی طرف سے ہوتے ہیں۔ یہ سوالات جانبدارانہ ہوتے ہیں اور ہر فریق اپنے مطلب کی بات ریکارڈ پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ غیر جانبدارانہ سوالات جس سے حقیقت حال واضح ہو، فریقین میں سے کوئی نہیں کرتا اور عدالتی سوالات شاذ و نادر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بسا اوقات مقدمہ کے انتہائی اہم امور پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں۔ جو ترتیب اوپر بیان کی گئی ہے، اس کے مطابق پہلے عدالتی سوالات کے ذریعے حقیقت حال غیر جانبدارانہ طور پر واضح ہو سکے گی جس کے بعد اگر فریقین میں سے کوئی کچھ سوالات کرنا چاہے تو کر سکے گا۔ لیکن گواہ کو گمراہ کرنے یا عدالت پر غلط اثر ڈالنے کا انسداد ہو سکے گا۔

۶۔ مروجہ قانون شہادت مندرجہ ذیل معاملات میں خاموش ہے جبکہ ان ابواب کا قانون شہادت میں ہونا بہت ضروری ہے:

(۱) مدعیٰ علیہ کا حلف، اس کا طریقہ کار اور اس کے اثرات

(۲) نکول یعنی مدعیٰ علیہ اگر حلف سے انکار کر دے تو مقدمے پر اس کے اثرات

(۳) شہادت سے رجوع اور اس کے اثرات

(۴) اقرار سے رجوع اور اس کے اثرات

اسلامی قانون شہادت مروجہ قانون شہادت سے کافی مختلف ہے لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مروجہ قانون

شہادت کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی قانون شہادت کو الگ سے مرتب کیا جائے۔

۷۔ موجودہ نظام عدالت میں اپیل کے مرحلہ پر اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غیر معمولی تاخیر نہ ہو۔ عام طور پر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ اپیل متعلقہ عدالت میں دائر ہو جاتی ہے جو ایک طویل مدت کے بعد اس لیے خارج کی جاتی ہے کہ یہ اپیل قابل رفتار نہیں ہے۔ اس خامی کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سعودی عرب اور دیگر بعض اسلامی ریاستوں میں ہے کہ ایک ''مجلس تمییز'' تشکیل دی جائے اور متعلقہ عدالت میں اپیل دائر ہونے سے قبل اپیل اس مجلس کے سامنے پیش کی جائے۔ اگر یہ مجلس اس نتیجے پر پہنچے کہ اپیل دائر کرنے کے قابل ہے تو اس کے بعد متعلقہ عدالت میں سماعت کے لیے دائر کی جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر اپیل دائر ہونے کے قابل نہ ہوگی تو وہیں سے واپس کر دی جائے گی اور مزید وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔

عدالتی نظام میں اگر ان خامیوں کا ازالہ ہو جائے تو ان شاء اللہ عدل وانصاف کے تقاضے بطریق احسن پایہ تکمیل کو پہنچیں گے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین۔

سیاسی امور میں فتویٰ دینے کے بارے میں جامعہ ازہر کی رائے

شیخ الازہر الدکتور طنطاوی کی سربراہی میں کام کرنے والی مجلس البحوث الاسلامیۃ نے جامعہ ازہر کی فتویٰ کمیٹی کے لیے نئی ہدایات جاری کی ہیں جس میں کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں نیز ایسے امور میں جن کا تعلق دوسرے ممالک کے داخلی حالات سے ہے، کوئی فتویٰ جاری نہ کریں۔ شیخ الازہر نے کہا کہ جامعہ ازہر کو ''کسی بھی دوسرے ملک کے معاملات میں فتویٰ دینے کا حق نہیں بلکہ ہر ملک کے علما اپنے ملک کے معاملات میں فتویٰ دینے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔'' مجمع البحوث الاسلامیۃ کے سیکرٹری جنرل الشیخ سید وفا ابو عجوز نے کہا ''جامعہ ازہر کی فتویٰ کمیٹی کی ذمہ داری اصلاً ان اجتماعی معاملات اور وراثت وغیرہ کے مسائل میں فتویٰ دینے کی ہے جو افراد اور خاندانوں کو درپیش ہوتے ہیں، لیکن اسے کسی سیاسی معاملے میں فتویٰ جاری کرنے کا اختیار نہیں کیونکہ سیاسی معاملات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ الگ سے موجود ہیں جو ان معاملات کی پیچیدگیوں کو جانتے اور ان میں بہتر لائحہ عمل تجویز کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

(ہفت روزہ ''العالم الاسلامی''، ۱۵ ستمبر ۲۰۰۳ء)